© rasailojaraid.com

کی قدرتی قوتوں کے ابھرنے [illegible] کوئی تحریک بھی نہ ہوتی، اور اجتماعی زندگی کی وہ تمام سرگرمیاں ظہور میں نہ آتیں جن سے یہ تمام کارخانہ چل رہا ہے۔[51]

پس انسان کا مدارجِ معیشت کے لحاظ سے مختلف الاحوال ہونا دنیوی نظام کے اعتبار سے ضروری ہوا اور اس لیے بھی کہ انسان کے اعمال کی آزمائش ہو۔ اس سے انسان کی کسی فطری کمزوری کا اظہار مقصود نہیں۔ غریب امیر بن سکتا ہے اور امیر تغیرِ احوال کے ساتھ نانِ شبینہ کا محتاج ہو جاتا ہے۔ (وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳: ۱۳۹)) اس عالمِ اسباب و علل میں مختلف درجات کارفرما ہیں جن سے انسان کی سعی و طلب کا امتحان اور اس کے اعمال کی جزا و سزا ہے:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَٰٓئِفَ	اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں
الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ	صاحبِ اختیار بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ
بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَآ	بڑھایا۔ تاکہ (ظاہراً) تم کو آزمائے ان چیزوں میں جو
ءَاتَىٰكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ	کہ تم کو دی ہیں بالیقین آپ کا رب جلد سزا دینے والا
الْعِقَابِ وَإِنَّهُۥ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ	بھی ہے اور بالیقین وہ واقعی مغفرت کرنے والا مہربان
(۶: ۱۶۶)	(بھی) ہے۔

استخلاف فی الارض کی اہلیت و استعداد کے لیے افراد اور قوموں کا جن اعمال میں امتحان ہوتا ہے، ان میں سے رزق کا معاملہ بھی ہے۔ جن کو رزق زیادہ دیا ہے ان کی آزمائش اس امر میں ہے کہ کس طرح وہ اپنے اعمال سے تقسیمِ رزق میں ہمواری پیدا کرتے ہیں۔ حقیقی عزت و تکریم رزق کی زیادتی میں نہیں بلکہ تقویٰ میں ہے، جس کے ذریعے انسان دوسرے انسانوں کو اپنا بھائی سمجھ کر ان کے حقوق ادا کرتا ہے اور جو اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی ان کے لیے پسند کرتا ہے۔ قرآن حکیم نے اہلِ رزق پر ایک بڑی بھاری ذمہ داری عائد کی ہے اور انھیں ان کی ذمہ داریوں اور فرائض سے اس طرح متنبہ کیا ہے:

---

[51] ترجمان القرآن مصنفہ مولانا ابو الکلام آزاد

© rasailojaraid.com

لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

(۲۸:۷۷)

تو اس مال و حشمت پر مت اترا، واقعی اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور تجھ کو خدا نے جتنا دے رکھا ہے اس کے ذریعہ سے عالمِ آخرت کی بھی جستجو کیا کر اور اپنا مال خرچ کر کے دُنیا کے سامان سے اپنا حصہ (آخرت میں لے جانا) فراموش نہ کر اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی (بندوں کے ساتھ) احسان کر اور اس مال و حُسنِ سلوک کو دوسروں سے روک کر دنیا میں فساد کا خواہاں مت ہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ اہلِ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

جس طرح اعمال میں رُشد و ہدایت کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اس طرح رزق کے معاملے میں کشائش و فراخی افراد کی اصلاحِ حال اور جماعتوں کے مواسات و تواصی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

معاشی مُساوات

اب سوال یہ ہے کہ اختلافِ مدارج اور تزاحم و تنافس کے باوجود اسلام کا اصولِ مساوات معاشی مسئلہ میں کس طرح قائم ہوتا ہے؟

"قرآن اس صورتِ حال سے تو تعرض نہیں کرتا کہ معیشت کے اعتبار سے تمام انسانوں کی حالت یکساں نہیں، کسی کے پاس زیادہ سامانِ معیشت ہے کسی کے پاس کم۔ لیکن وہ یہ صورت حال برداشت نہیں کر سکتا کہ حصولِ رزق کے اعتبار سے لوگوں کی حالت یکساں نہ ہو، کسی کو ملے کسی کو نہ ملے۔ وہ کہتا ہے ہر انسان جو دنیا میں پیدا ہوا ہے دنیا کے سامان و رزق سے حصہ پانے کا یکساں طور پر حق دار ہے۔ اور کسی فرد و گروہ کو حق نہیں کہ اس سے اسے محروم کر دے۔ خواہ وہ طاقت ور ہو یا کمزور، تندرست ہو یا بیمار، قابل ہو یا ناقابل، دولت مندوں کے گھر پیدا ہو یا فقیروں کے، لیکن اگر انسان ہے تو ماں کے پیٹ سے وہ یہ حق لے کر آیا ہے کہ وہ زندہ ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ کما سکے یا نہ کما سکے لیکن اسے زندہ رہنے کا سامان ملنا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے کہ کمائی کے حق کا دامن انفاق کی ذمہ داری سے بندھا ہوا ہے، یہ دونوں لازم وملزوم ہیں، تم انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ یہاں کمائی کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ خرچ کرنے کی ذمہ داری اٹھائی جائے۔ اگر تم کچھ نہیں کما سکتے، تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، جوں ہی تم کمانے لگے، تم پر ذمہ داری عاید ہوگئی۔ اب یہ جتنی بڑھتی جائے گی، انفاق کی ذمہ داری بھی بڑھتی جائے گی...... وہ کہتا ہے۔ افراد کے ہاتھ کمائی کے لیے ہیں لیکن جماعت کا حق خرچ کرانے کا ہے۔ افراد جتنا کما سکتے ہیں کمائیں لیکن ڈھیر لگانے کے لیے نہیں، خرچ کرنے کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکتناز کو روکنا چاہتا ہے۔ یعنی سونے چاندی کے ڈھیر لگانے کو۔ اور کہتا ہے، ان کے لیے عذاب عظیم کی بشارت ہے جو ڈھیر لگاتے ہیں اور خرچ نہیں کرتے۔ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا (۹: ۳۴)

اس تمام تفصیل سے معلوم ہوا کہ جہاں تک نظامِ معیشت کا تعلق ہے، قرآن نے اکتسابِ مال کا معاملہ انفاقِ مال کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ وہ فرد کے حقِ اکتساب سے تعارض نہیں کرتا۔ لیکن اس حق کو انفاق کی ذمہ داری ساتھ باندھ دیتا ہے۔ جس قدر کما سکتے ہو، کماؤ۔ لیکن کوئی کمائی جائز تسلیم نہیں کی جا سکتی اگر انفاق سے انکار کرتی ہو۔ ہر وہ کمائی جو محض "اکتناز" کے لیے ہو اور انفاق کے لیے دروازہ کھلا نہ رکھے، قرآن کے نزدیک ناجائز، ناپاک اور مستحقِ عقوبت ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ٥

اور (دیکھو) اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر باعتبار روزی کے برتری دی ہے (کہ کوئی زیادہ کماتا ہے کوئی کم کماتا ہے) پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جس کسی کو زیادہ روزی دی گئی ہے وہ اپنی روزی اپنے زیرِ دستوں کو لوٹا دے۔ حالانکہ سب اس میں برابر کے حق دار ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱۶ : ۷۱) اللہ کی نعمتوں سے صریح منکر ہو رہے ہیں؟

اس آیت میں فرمایا: وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ سروسامانِ رزق کے اعتبار سے سب کی حالت یکساں نہ ہوئی، کسی کے پاس زیادہ ہے، کسی کے پاس کم ہے، کوئی بالکل محروم ہے فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ پھر جن لوگوں کو رزق میں برتری دی گئی ہے وہ ایسا کرنے والے نہیں کہ اپنی کمائی ہوئی روزی اپنے غلاموں اور زیردستوں کو دے دیں فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ حالانکہ جو روزی انھوں نے کمائی ہے وہ کچھ ان کی خلق کی ہوئی نہیں ہے، اللہ ہی کی دی ہوئی ہے اور اس لیے رزق کے حق دار ہونے میں وہ سب برابر ہیں۔ خواہ کوئی زیردست ہو کر محروم ہو گیا ہو، خواہ کوئی زبردست ہو کر خوش حال ہو گیا ہو۔ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ پھر کیا یہ اللہ کی نعمت کے منکر ہیں؟ اللہ کی نعمت کے۔ کیونکہ دنیا میں جس قدر سامان معیشت ہے وہ دراصل فطرت کی پیداوار ہے۔ کسی فردِ انسانی کی پیدا کی ہوئی نہیں ہے۔ اور اگر ایک فرد کے قبضہ میں آجاتی ہے تو یہ ایک اللہ کا فضل ہے۔ پس چاہیے کہ اس کی شکر گزاری بجا لائی جائے، نہ یہ کہ کفرانِ نعمت کیا جائے۔ اس کی شکرگزاری کیا ہے؟ ان افراد پر خرچ کرنا جو اس کے حصول سے محروم ہیں۔[1]

مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن سے جو طویل اقتباس ہم نے نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ نظامِ معیشت کے معاملے میں قرآن کا رُخ کس طرف ہے۔ مولانا کا فضل و کمال، ان کا تبحر فی العلم اور رسوخ فی القرآن مسلّم ہے اور ان کے ترجمہ و تشریح کے مطالعہ کے بعد اسلام کے نظامِ معیشت کی اس بنیادی تعلیم پر کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ روزی کے معاملہ میں اسلام امیر اور غریب کو ایک سطح پر لے آتا ہے۔ اس آیت میں افراد اور جماعتوں کے "حقوق" و "فرائض" کی تعیین کر دی ہے۔ قطع نظر زکوٰۃ و صدقات یا مستحب و نفلی خیرات کے، کارخانۂ حیات میں انفاق فی سبیل اللہ کا جو بلند و برتر اور صحیح تر مقام ہے وہ انھی حقوق و فرائض کی مخلصانہ ادائیگی سے حاصل ہوتا ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن مصنفہ مولانا ابوالکلام آزاد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطالب کی مزید توضیح

مولانا ابوالکلام آزاد ان آیات کا مندرجۂ صدر ترجمہ کرنے میں منفرد نہیں ہیں۔ ہمارے خیال میں اسلامی مفکرین اس مرکزی نقطے سے جو یہاں بیان ہوا ہے، بے خبر نہیں ہیں۔ ہماری نظر سے انگریزی کی ایک کتاب گزری ہے جس کا نام "دی وزڈم آف دی قرآن (حکمتِ قرآنی)" ہے۔ اس کتاب میں ترکی عالم جنرل محمود مختار پاشا مرحوم نے قرآن حکیم کی ان منتخب آیات کا ترجمہ پیش کیا ہے جن میں اسلامی اصولِ معاشرت، اخلاق و اجتماع سے متعلق تعلیم دی گئی ہے۔ انگریزی ترجمہ یونیورسٹی پریس لندن نے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں آیت زیرِ بحث کا مطلب وہی بیان کیا گیا ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمہ اور تشریح سے اخذ ہوتا ہے۔ انگریزی عبارت کا ترجمہ اردو میں درج ذیل ہے:-

> اللہ تعالیٰ نے اکتساب سے متعلق تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ جن کو فضیلت دی گئی ہے وہ اپنے ملازمین کو ان مکتسبہ فوائد میں شریک کر لیتے ہیں[1]۔ اس طرح وہ اور ان کے آقا اپنا اپنا مساوی حصہ حاصل کر لیتے ہیں۔ تو کیا وہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت و برکت کا جس سے اس نے ان کو نوازا ہے، انکار کر دیں گے؟

خواجہ احمد الدین امرتسریؒ نے اپنی تفسیر "بیان للناس" میں بھی یہی مفہوم پیش کیا ہے۔ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

> پھر انسان میں بخل کا جذبہ بڑے زور شور سے کام کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ادنیٰ لوگوں کو اعلیٰ لوگوں کی صف میں بٹھایا جائے اور غلاموں کو بادشاہ بنایا جائے۔ لیکن لوگ اس مال میں جو خدا نے انھیں دیا ہوا ہے، غلاموں کو اپنے مساوی بنانا نہیں چاہتے وہ اپنے مال کو خدا کا انعام نہیں سمجھتے

---

[1] ماسے نافیہ کا ترجمہ اس میں موجود نہیں۔ مدیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس مال کو ماں کے پیٹ سے ہی اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔ جیساکہ فرمایا: "اور اللہ نے ہی تمہارے بعض کو دوسرے بعض پر روزی میں فضیلت دی ہے۔ سو وہ لوگ جن کو فضیلت دی گئی ہے، اپنی روزی کو غلاموں پر موڑنے والے نہیں ہوتے (بایں خوف) کہ وہ اس میں برابر ہوجائیں۔ کیا (وہ ایسا کریں گے اور اپنے مالوں کو اپنی نعمت سمجھیں گے) پھر اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کریں گے؟"

مروجہ تراجم کا مطلب یہ ہے کہ مالک اپنے مملوک کو اگر اس قدر اپنی کمائی میں سے دے دے کہ دونوں برابر ہوجائیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار ہے ان کو وہ کمائی اپنے پاس ہی رکھنی چاہیے تھی۔ کیونکہ یہ اللہ کی دی ہوئی فضیلت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان تراجم کے سقم کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:۔

"اس آیت میں فَهُمْ فِيهِ سَوَآءٌ کا مطلب قرار دیتے ہوئے مفسرین نے اسے عدم تساوی پر محمول کیا ہے اور تقدیر عبارت یوں قرار دی ہے کہ فَهُمْ فِيهِ سَوَآءٌ بعضوں نے فَهُمْ کی فاء کو "حتیٰ کہ" کے معنوں میں لیا ہے۔ لیکن جملہ کا صاف صاف مطلب وہی ہے جو ہم نے قرار دیا ہے یعنی یہ تصریح حال کی خبر ہے۔ نہ کہ اس کی نفی۔ اور جب مطلب ٹھیک بیٹھ رہا ہے تو پھر کون سی وجہ ہے کہ جگہ سے ہٹنے کے لیے مضطرب ہوں۔" [۵]

اس میں شک نہیں کہ ان مفسرین نے جن کے تفسیری مطالب سے ہم نے استفادہ کیا ہے عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مطالب غلط ہیں، یا آیت متذکرۂ صدر ان معنی کی متحمل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی حقائق کی کوئی انتہا نہیں اور انسانی نسلیں ابدالآباد تک بھی ان حقائق کا احاطہ نہیں کرسکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہمیشہ کے لیے بنی نوع انسان کی ہدایت کا نصاب ہے اور اس کی آنے والی ضرورتوں میں کامل راہبر۔

---

[۵] ترجمان القرآن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متقدمین مفسرین آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کر دیتے تھے۔ مگر حزم و یقین کے ساتھ انھیں معانی کو بیان کرتے تھے جو ان کے زمانے کے عقول اور اذہان کے مطابق ہوتے تھے۔ آج کے مفسر کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے زمانے کی ضروریات کو سامنے رکھ کر ان کا حل قرآن مجید سے تلاش کرے۔ اور اگر متقدمین کا کوئی قول مل جائے تو اس کو تائید میں نقل کر دے۔ چنانچہ اس آیت کی تفسیر "تفسیر کشاف" (جار اللہ زمخشری متوفی ۵۲۸ھ) میں بحوالہ روح المعانی (جلد ۱۴) یوں منقول ہے:-

واختار فی الکشاف ان المعنی انہ سبحانہ جعلکم متفاوتین فی الرزق فرزقکم افضل رزق ممالیککم وھم بشر مثلکم و اخوانکم وکان ینبغی ان ردوا فضل مارزقتموا علیھم حتی تساووا فی الملبس والمطعم کما یحکی عن ابی ذر رضی اللہ عنہ	اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارزاق میں فرق رکھے ہیں۔ تمھارے رزق تمھارے غلاموں اور ماتحتوں سے زیادہ ہیں، حالانکہ وہ بھی تم جیسے انسان ہیں اور مناسب یہ ہے کہ تم اپنے رزقوں میں سے فالتو ان کی طرف لوٹا دو۔ یہاں تک کہ لباس اور طعام میں تم میں اور ان میں فرق نہ رہے اور مساوات قائم ہو جائے۔

تفسیر القرآن بالقرآن

لادینی اور مغربیت کی جو تحریکیں دورِ حاضر میں انسانی دل و دماغ کو پریشان کر رہی ہیں ان کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ مسلمان قرآن مجید کی تعلیمات کا از سرِ نو مطالعہ کریں اور سورۂ نحل کی اس آیت کی تفسیر کو جو ہم نے نقل کی ہے تسلیم کر لیں۔ قرآن مجید میں معاشی مساوات پر یہ آیت نص کا حکم رکھتی ہے اور اس کی سند سے ہمارا معاشی نظام حقیقی اخوت و مساوات کے اسلامی اصول پر قائم ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت اس بارے میں محکمات میں سے ہے مگر اس آیت کے ہم معنی تعلیم قرآن مجید کے ہر صفحہ پر نمایاں ہے اور علمائے اسلام نے اسلامی معاشی مساوات کے اصول کو قرآن مجید کی دوسری آیات سے نکالا ہے۔ مگر (ہمارے خیال میں) بطریق استخراج نہ کہ بطریقِ نص۔ چنانچہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ آیت ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (سورۂ بقرہ) کی

© rasailojaraid.com

تفسیر میں اپنی کتاب [illegible] فرماتے ہیں:
© rasailojaraid.com

"جملہ اشیاء عالم بدلیل فرمان واجب الاذعان خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا تمام بنی آدم کی مملوک معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی غرض خداوندی تمام اشیاء کی پیدائش سے رفع حوائج جملہ ناس (انسان) ہے اور کوئی شے فی حد ذاتہ کسی کی مملوک خاص نہیں۔ بلکہ ہر شے اصل خلقت میں جملہ ناس (انسان) میں مشترک ہے اور من وجہ سب کی مملوک ہے۔ ہاں بوجہ رفع نزاع وحصول انتفاع قبضہ کی علت ملک مقرر کیا گیا اور جب تلک کسی شئے پر ایک شخص کا قبضہ تامہ مستقلہ باقی رہے، اس وقت تک کوئی اور اس میں دست درازی نہیں کرسکتا۔ ہاں خود مالک و قابض کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے بلکہ اس کو اوروں کے حوالہ کرے کیونکہ باعتبار اصل اوروں کے حقوق اس کے ساتھ متعلق ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مال کثیر حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہ ہوا، گو زکوٰۃ بھی ادا کردی جائے۔ اور انبیاء و علماء اس سے بغایت مجتنب رہے۔ چنانچہ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے بلکہ بعض صحابہ و تابعین وغیرہم نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام ہی فرما دیا۔ بہرکیف غیر مناسب و خلاف اولیٰ ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ زائد علی الحاجت سے اس کی کوئی غرض متعلق نہیں، اور اوروں کی ملک من وجہ اس میں موجود۔ تو گویا شخص مذکور من وجہ مال غیر پر قابض و متصرف ہے۔ اور اس کا حال بعینہ مال غنیمت کا سا تصور کرنا چاہیے۔ وہاں بھی قبل تقسیم یہی ہے کہ کل مال غنیمت تمام مجاہدین کا مملوک سمجھا جاتا ہے مگر بوجہ ضرورت وحصول انتفاع بقدر حاجت ہر کوئی مال مذکور سے منتفع ہو سکتا ہے۔ ہاں حاجت سے زائد جو رکھنا چاہے اس کا حال آپ کو بھی معلوم ہے کہ کیا ہونا چاہیے؟"

حضرت مولانا کی تشریح ہم نے "برّ" کا پیش کردی۔ مگر ہم آیت منصوص کے بعد کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں سمجھتے، تاہم احادیث، اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم و اسوۂ صحابہؓ سے اپنے موقعہ پر استمداد کرتے وقت علماء امت کے چند اقوال بھی پیش کریں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا وجدی الحسینی

عربی ہی اُمّ الالسنہ کیوں؟

آیئے ! اب ان مذکورہ بالا نظریات پر ایک سرسری نظر ڈال کر دیکھیں، ان تمام نظریوں میں مقبول عام نظریہ، پہلا ہے کہ انسان نے نیچر کی آوازوں کو نقل کر کے آہستہ آہستہ زبان بنالی۔ اس سلسلہ میں شیرخوار بچہ کی مثال دی جاتی ہے کہ وہ جو سنتا ہے وہی بولتا ہے، اب اگر تنقیدی نظر سے اس پر غور کیا جائے تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی بچہ کے آگے صرف مہمل و بے معنی کلمات بولے جائیں تو کیا وہ زبان کے الفاظ پر قابو پالے گا؟ کیا وہ موضوع الفاظ بولنے پر قادر ہو سکے گا؟

جہاں تک اکبر بادشاہ کے گنگ محل کے عملی تجربہ کا تعلق ہے تو سوائے اس کے کوئی جواب نہیں کہ وہ سب بچے گنگ زبان تھے۔ اور ہوں گے اور مہمل الفاظ کے نکالنے کے سوا اور کسی بات پر قادر نہ ہوں گے؟

آج بھی اس کا تجربہ ہو سکتا ہے۔ ایک بچہ وہی آواز یا لفظ منہ سے نکالنا سیکھے گا جو اس نے سنے ہوں گے۔ ایک ہندوستانی بچہ اگر انگلستان میں اور انگلستانی بچہ ہند میں پرورش پائے تو ان کی زبان انگریزی اور ہندوستانی ہوگی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان خود زبان نہیں بناتا بلکہ بنی بنائی زبان کے الفاظ سن کر نقل کرتا ہے اور زبان سیکھ لیتا ہے۔ اگر بچہ کی مثال ایک صحیح مثال ہے تو جس طرح ایک بچہ پہلے سے بنی بنائی زبان اخذ کرتا ہے، ضرور ہے کہ انسانی بچہ کے سامنے پہلے سے بنی بنائی زبان موجود ہو جس کو سن کر وہ نقل کرے۔

صوتیاتی نظریے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اس لیے کہ اگر صوتی الفاظ کائناتی آوازوں کی نقالی سے بنے ہیں تو پھر ہزارہا غیر صوتی کلمات کہاں سے زبانوں پر عالم وجود میں آئے؟ یقیناً وہ الفاظ انسان نے کہیں سے سنے اور پھر نقل کیے ہوں گے۔ یہ آواز کہاں سے سنی یا دل میں کس نے ڈالی؟

اس سوال کا جواب ہی زبان کے الہامی ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ علاوہ ازیں خود لسانیاتی اصول الفاظ کی ساخت کے بارے میں ہر زبان میں جاری ہے، وہ اس امر کی روشن دلیل ہے کہ زبان کامل طور پر انسانوں کی خود ساختہ و پرداختہ نہیں۔

وہ یہ کہ ہر زبان والا نئے خیال کے اظہار کے لیے یا نئی چیز کے مشاہدہ پر اس کو نیا نام دینے کے لیے پرانے ذخیرہ پر حصر کرتے ہیں۔ ایسی ضرورت لاحق ہونے پر فوراً ذہن اس تلاش میں لگ جاتا ہے کہ اسے کسی پرانے خیال یا پرانی چیز سے مشابہت تو نہیں۔ اگر اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس قدیم لفظ سے اخذ کر کے کچھ توڑ پھوڑ کر نیا لفظ تجویز کر لیا جاتا ہے، یا پھر دوسری زبان کا لفظ مستعار لے کر اپنے یہاں داخل کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک فطری طریقہ انسانی سوسائٹی میں نامعلوم زمانہ سے چلا آرہا ہے کہ ہمیشہ نئے الفاظ پرانے ذخیرہ سے لیے جاتے رہے ہیں۔ جب انسانی شعور کے بیدار ہونے پر یہ طبعی ضرورت پیش آئی ہوگی تو ضروری ہے کہ پہلے سے کچھ ذخیرہ موجود ہوگا اور اس ذخیرہ میں سے تراش خراش کر خراد پر چڑھا کر الفاظ کو ڈھالنا پڑا ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ ذخیرہ طبعی آوازوں کا تھا یا وہ آوازیں تھیں جو اس نے خارجی تاثرات کے ماتحت نکالیں، انھوں نے اس ذخیرہ کا کام دیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی زبان بننے کے لیے ضروری ہے کہ متکلم و مخاطب کسی خاص آواز کے خاص مفہوم کے لیے آپس میں سمجھوتہ پہلے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ہو۔ اس لیے ایک زبان کے بننے سے پہلے انسان پر ایک زمانہ گزرنا چاہیے جب انسان باہمی خاص آواز کی بابت سمجھوتہ کرلیں۔ جانوروں میں تو یہ سمجھوتہ فطرت نے دیگر جبلتوں کی طرح ان کے اندر ودیعت کردیا ہے۔ لیکن انسانوں نے اس قسم کی مفاہمت یا باہمی سمجھوتہ کی کانفرنس کب منعقد کی اور کہاں منعقد ہوئی کہ ان الفاظ کے مفاہیم آج سے یہ طے پائے ہیں ؟

جب آج بھی ہم ایجادات و اختراعات کے لیے اپنے پرانے ذخیرۂ لغات پر قدرتی طور پر خود کو مجبور پاتے ہیں تو یہ کیونکر تسلیم ہوسکتا ہے کہ جب انسانیت عالم طفولیت سے گزر رہی تھی اور ہر معاملہ میں داعیۂ فطرت کی تربیت و کفالت کی محتاج تھی۔ اتنے اہم جرأت انگیز اقدام میں کیوں کر کامیاب ہوگئی ؟

آج بھی جب مختلف زبانوں کے زائد الفاظ پر تحقیقی طور پر نظر ڈالتے ہیں تو کوئی سا ایسا لفظ دستیاب نہیں ہوتا جس کو پرانے معدن (کان) سے باہر نکال کر نہ لایا گیا ہو۔ عقلی طور پر ایجادِ لفظ ممکن ہو لیکن فطرتِ انسانی کے مطالعہ کی روشنی میں یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ یہ انسان کی عادت نہیں کہ چند حروف کو نئی ترتیب دے کر کسی مفہوم کی ادائگی کے لیے نیا لفظ بنالے۔ اس سے یہ قدرتی نتیجہ نکلتا ہے کہ

"انسان زبان بناتا نہیں بلکہ سیکھتا ہے جیسے کہ بچے کی مثال سے واضح ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ سیکھنے میں اس سے پہلے ایک ذخیرہ اس قسم کے الفاظ کا موجود ہونا چاہیے جن کے مفہوم سے اس وقت کی جمعیت واقف ہو۔"

انسان کی دیگر فطری قوتوں کی نشو و نما اور ارتقاء اور ان کی پیدائش پر غور کیا جائے تو اس سے بخوبی وضاحت مذکور الصدر امر کی ہوتی ہے۔ انسان کے اندر جس قدر قوتیں ہیں، ان کا نشو و نما دراصل اس احساس و تمیز کا نشو و نما ہے جو ہم ایک قوت کے متعلق مختلف چیزوں میں کرتے ہیں۔ قوتِ ذائقہ و شامہ و لامسہ وغیرہ ان سب کا ارتقاء ان سے متعلق اشیاء کے امتیاز و احساس پر مبنی ہے۔ مثلاً قوتِ شامہ کا نشو و نما یہ ہے کہ خوشبودار اور بدبودار اشیاء میں صحیح تمیز ہوسکے۔ ایسے ہی قوتِ ذائقہ کا ارتقاء میٹھے، سیٹھے، کڑوے، پھیکے کی تمیز سے حاصل ہوتا ہے۔ علاوہ قوتِ لامسہ بھی مختلف [illegible] اتصالات کا احساس پیدا کرتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح زبان اور اس کے مختلف الفاظ و معانی میں ہمارا آشنا ہونا اس امتیاز پر مبنی ہے جو مختلف آوازوں کے احساس کے نشو و نما سے ہوتا ہے جس کا تعلق قوت تکلم و قوتِ سماعت سے ہے۔

کسی زبان کے بولنے اور سمجھنے کی حقیقت کیا ہے قوتِ تکلم اور قوتِ سماعت، ان امتیازات سے آشنا کرتا جو مختلف آوازوں اور ان کے مفہومات میں موجود ہے۔ ایک طرف ہمارے قوائے کلامی مختلف آوازوں سے مختلف مفہوموں کے سمجھنے کے خوگر ہوتے ہیں اور دوسری طرف ہمارے کان ان مختلف آوازوں کو جو مختلف مفہوموں کے لیے متعین ہوئے تمیز کرنے لگتے ہیں تو ہم زبان سے واقف ہوتے ہیں۔

بہرکیف یہ سب انسانی قوی نشو و نما یافتہ سمجھے جا سکتے ہیں، جب ان میں مختلف امتیازات کا احساس پیدا ہو جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس احساس کا منبع کیا ہے؟ یہ احساس داخلی طریق پر پیدا ہوتا ہے یا خارجی طریق پر؟

فطرت کا قانون ہے کہ ہماری کل قوتیں (جو فطرت خوابیدہ کی حیثیت سے اندر موجود ہیں) اس وقت عالم وجود میں قدم رکھتی ہیں جب خارج میں اس کا سامان موجود ہو۔

اگر گلاب و حنظل پہلے سے موجود نہ ہوں تو بدبو و خوشبو کی تمیز محال ہے۔ اگر آم اور املی موجود نہ ہوں تو میٹھے کھٹے کا احساس ناممکن ہے۔ اسی پر قیاس کرکے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ہماری قوتِ گویائی کو فعل میں لانے سے پہلے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہونا ضروری ہے۔

جب ہماری کل قوتیں اپنے نشو و نما کے لیے ان چیزوں کے پہلے سے موجود ہونے کی محتاج ہیں جن سے ان کو کام پڑتا ہے تو پھر قوت کلام و سمع کے لیے جہاں تک زبان سیکھنے کا تعلق ہے کیوں الفاظ کا پیش از وقت ہونا ضروری نہ ہو۔ یہی صورت بر نتیجے میں نظر آتی ہے جب بچہ مادری زبان سیکھتا ہے اور یہی ضرورت خود ہم محسوس کرتے ہیں جب کوئی غیر زبان سیکھتے ہیں۔ اس لیے علمائے فرنگ کے تمام نظریات در قیاس سے بالاتر اور مسلم ہو گئے ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ جس خلاقِ عالم نے اس عالمِ کون و مکان کو پیدا کر کے اپنی صفات کا ...

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا آئینہ دار بنایا اور خود انسان کو مجموعۂ کائنات بنا کر مظہر قدرت قرار دیا اسی نے زبان کو حقیقت کا ترجمان، انسانی فضیلت کا نشان، اظہار جذبات کا بہترین آلہ بنایا۔

بہ الفاظ دیگر زبان کی پیدائش الہام ربانی سے تو ہوئی ہے لیکن قدرت نے اسباب طبعی اور وضع انسانی کو بھی اس کی آفرینش میں دخیل بنایا ہے۔ جس طرح ہزارہا ایجادات و اختراعات کا نمایاں دفعتہً ذہنِ انسانی میں نمودار ہوا اور وہ ایجاد معرض وجود میں آگئی، اسی طرح ہزارہا الفاظ خدا کی طرف سے قلب میں پیدا ہوئے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ بے شمار کلمات والفاظ انسانی ضرورتوں نے ایجاد کیے ہیں اور وہ خود اس کے غور و فکر کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئے، خواہ اس ایجاد کا باعث نظریۂ صوتیہ کے مطابق مختلف آوازوں کا پیدا کرنا رہا ہو یا اس کی تخلیق میں مختلف جذبات کے مختلف آوازوں سے اظہار کی کارفرمائی ہو یا دماغ انسانی کے وہ مختلف تاثرات ان الفاظ کی پیدائش کا سبب ہوں جو اشیاء کے تصادمات سے اُبھرے ہوں۔

زمانۂ حال کے ماہرینِ السنہ (فیلالوجسٹ) کے مختلف نظریات یکسر باطل و غلط ہرگز نہیں ہیں لیکن ان کی مضحکہ خیزی کا سامان وہیں سے شروع ہوتا ہے جہاں وہ فطرت کی احسان مندی سے سبکدوش ہونے کے لیے تنہا اسی ایک نظریہ کو وجہ پیدائش قرار دینے کی سعی لاحاصل میں مصروف نظر آتے ہیں۔

قدرت نے جہاں زبان کو الہامی طریقے سے انسان کے دل میں ڈالا وہاں خود انسان کو بھی تخلیق و ارتقاء کی بہترین صلاحیت سے ممتاز کیا۔ اس نے اپنی خداداد صلاحیت کے ذریعہ ان مذکورالصدر شکلوں سے زبان کے ذخیرہ کو بڑھانے اور مختلف کلمات والفاظ سے زبان کے خزانے کو مالا مال کرنے میں زبردست حصہ لیا۔

عالم حیوانات کے برخلاف انسان نے قدرت کے اس الہام کی روشنی میں اپنی ترقی پذیر استعداد سے زبان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ روز آفرینش سے زبان، ذخیرۂ الفاظ اور مختلف اسالیب کلام سے اس قدر آراستہ نہیں تھی، انسانی ذہن کی کاوشوں سے یکسر انکار کر کے مکمل و مفصل موجودہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ن کو عطیہ ربانی کہنا صحیح نہیں کہ ابتدائے آفرینش میں بلا خلقت سے انسان کو زبان مرحمت کی گئی۔

یہ خیال بداہتہً غلط ہے جو لوگ زبان کو الہامی کہتے ہیں، ان کے نزدیک بھی یہ بات واقعیت وحقیقت کے خلاف ہے کہ موجودہ ترشی ترشائی، آراستہ و پیراستہ زبان من جانب اللہ پہلے ہی دن آسمان سے نازل ہوئی ہے اور انسان کا دخل مواقع استعمال کے سوا اور کہیں نہیں ہے۔

ہر زبان کا یہ تناور درخت (جس کی چھاؤں میں قومیں اپنے خیالات وجذبات کی رنگا رنگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں) روز ازل سے اس قدر تناور اور بڑا ہرگز نہیں تھا، اس کا تخم قدرت کی جانب سے زمینِ فطرت میں پوشیدہ تھا، مجموعہ انسانیت نے اپنی جد وجہد پسندی، آبیاری سے نشو ونما دے کر موجودہ ترقی یافتہ حالت تک پہنچایا، کیوں کہ زبان کا تعلق فرد کی انفرادی زندگی سے نہیں بلکہ افراد کی اجتماعی زندگی اس کی نشو و ارتقاء کی ذمہ دار ہے اس لیے زبان کی تاریخ نوعِ انسانی کی تاریخ سے وابستہ ہے۔

بہرکیف زبان کی تخلیق و ارتقاء میں اشاراتی، اصواتی، جذباتی، تصادماتی وجوہ کا ضرور دخل ہے لیکن اس کی بنیاد فطرت انسانی میں قدرتی طور پر ودیعت کی گئی تھی۔ انسان نے تہذیب وتمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اظہار خیالات وجذبات کے لیے نت نئے الفاظ ایجاد کیے۔

جب آدمؑ کی اولاد محدود تعداد میں زمین کے ایک قطعہ میں مل جل زندگی بسر کرتی رہی، ایک زبان ان کی ضروریات کی کفیل اور اظہار خیالات میں معین و مددگار رہی۔ جوں جوں نسلِ انسانی کا دائرہ وسیع ہوتا گیا یہ ابتدائی محدود زمین سکونت وقیام کے لیے ناکافی بنتی گئی، مختلف علاقوں میں خاندانوں کا سلسلہ پھیلنے لگا، سرزمینوں کے تفاوت، آب وہوا کے فرق اور ضروریات کے باہمی اختلاف، فطرت وطبیعت کی رنگا رنگ تاثیرات کے لحاظ سے اپنی ابتدائی زبان میں ضرور برگ وبار پیدا ہونے لگے، دو چار نسلوں کے گزرنے کے بعد زبان زبان میں افتراق کی بنیاد پڑنے لگی۔ دس بیس پشتوں کے گزر جانے کے بعد تو ہر زبان نے عَلَمِ خود مختاری بلند کیا اور کچھ مدت کے بعد وہ مستقل زبان بن گئی۔

اس طرح اس ابتدائی زبان سے (جس کو ام الالسنہ کا لقب دیا جاتا ہے) شاخ در شاخ زبانیں نمودار ہونے لگیں، گو شروع میں اس کی جڑیں ام الالسنہ سے جڑی رہیں۔ لیکن بعد میں جب اس بار آور

© rasailojaraid.com